ماہنامہ نئی دہلی

منادی

گاہِ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی کا



مناديًا ينادي للايمان

بارگاہِ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ

محبوب الٰہیؒ سے ایمان اور امن کی ندا دینے والا

اور ان کے جانشین

امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ

منادی

نئی دہلی

مدیر

خواجہ حسن ثانی نظامی

معاون مدیر

خواجہ سید محمد ی نظامی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ:

خواجہ حسن ثانی نظامی

ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

سالانہ قیمت	پندرہ روپے ۱۵
غیر ممالک سے	تین پونڈ ۳
فی پرچہ	ایک روپیہ ۵۰ پیسے

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے — یہ ساٹھویں جلد (۱۹۸۵ء) کا ساتواں شمارہ ہے

فہرست

سرخ لکیر

عنوان کے نیچے ایک سرخ لکیر کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ادا کردہ منادی کی قیمت اس شمارے سے ختم ہو گئی اور دو لکیروں کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ شمارے سے ختم ہو جائے گی۔ جلد منی آرڈر کے ذریعہ قیمت بھیج کر ممنون فرمایئے یا وی پی کی اجازت دیجئے۔ وی پی میں آپ کے تین روپے پچیس پیسے زائد خرچ ہوں گے۔

(منیجر)

پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی ۱۳-۱۱۰۰ سے شائع کیا۔

مرا نسیم تو باید، صبا کجاست کہ نیست
کجاست زلفِ تو، مشکِ خطا کجاست کہ نیست

نسیم اور صبا کہاں نہیں ہیں۔ مگر مجھے تو آپ کی طرف سے آنے والا ہوا کا جھونکا درکار ہے۔
ملکِ خطار کی مشک ہر جگہ میسّر ہے۔ مگر میں تو آپ کی زلفِ مشکبو کا طلب گار ہوں۔

غلامانِ حضرت سلطان نظام الدین رح کو مژدہ!

چھ سو اکیاسیویں عرس مبارک کی گھڑیاں قریب
پہ چلنے والے سر کے بل چل کر بھی آتے تھے آپ موٹر ریل ہوائی جہاز سے ہی آئیے
نہ آسکیں تو دور ہی سے سلام اور نیاز کی سعادت حاصل کیجیے۔

عرس شریف ۱۶ ربیع الثانی سے ۲۰ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ تک ہوگا۔ خاص پروگرام ۱۷ ربیع الثانی کو صبح دس بجے حضرت محبوب الٰہی رح کی خانقاہ شریف واقع گوشہ شرق و شمال مقبرہ ہمایون میں فاتحہ سے شروع ہوگا۔ اسی دن حضرت رح کی حیات پاک اور تعلیمات پر ایک سیمینار خواجہ ہال میں عصر کے وقت ہوگا۔ اور رات کو فاتحہ نعت و منقبت اور سماع کی محفل ہوگی۔ دوسرے دن ۱۸ ربیع الثانی کو صبح نو بجے حضرت امیر خسرو رح کے مزار شریف کے سامنے حجرۂ قدیم میں فاتحہ اور سماع اور دن کو گیارہ بجے حضرت محبوب الٰہی رح کے روضہ مبارک کے سامنے صحن درگاہ میں عرس شریف کا خاص قُل۔ اسی دن بعد نماز مغرب خواجہ ہال میں فاتحہ اور سماع۔

عرس شریف کی تقریبات پانچ شبانہ روز جاری رہیں گی۔ نیاز اور لنگر وغیرہ کا اہتمام بھی انشاء اللہ حسب معمول ہوگا۔ جو حضرات اس میں حصہ لینا چاہیں۔ رقوم درج ذیل پتے پہ بھیج دیں۔ باہر سے آنے والے زائرین گرم کپڑے اور بستر ضرور ساتھ لائیں۔ کیونکہ دہلی میں یہ زمانہ سخت سردی کا ہوتا ہے۔

تشریف آوری کا منتظر
خواجہ حسن ثانی نظامی
حجرۂ قدیم درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رح۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

تار کا پتہ: خاجگان نئی دہلی۔
ٹیلی فون نمبر: ۶۱۹۸۰۷

حضرت امیر خسروؒ ـــ ایک ہمہ جہت شخصیت

(از عزت مآب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ)

خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی سال بھر میں کم از کم تین بڑے جلسے منعقد کرتی ہے۔ ایک حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے عرس پر، دوسرا حضرت خواجہ امیر خسروؒ طوطیٔ ہند کے یوم وصال اور تیسرا شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ کے عرس کے موقع پر۔ آج کا یہ علمی اجتماع بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں آپ نے بہت سے صاحبان علم و فضل کے مقالات اور تقریریں سنی ہیں۔ جن سے حضرت امیر خسروؒ کی زندگی، شخصیت اور فن کے نئے نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔ لیکن آج کا یہ جلسہ اس اعتبار سے بہت ممتاز ہے کہ آپ نے "حضرت امیر خسروؒ اور انسان" کے موضوع پر ایک ایسی ذی علم شخصیت کا خصوصی لیکچر سماعت فرمایا ہے جس کو تاریخ اور تصوّف میں سند کا مرتبہ حاصل ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ان ممتاز اساتذہ میں سے ہیں جنھیں ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ بین الاقوامی حلقوں میں بھی اپنے موضوع کے سنجیدہ عالموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں تصوّف کے مطالعہ کو ایک زندہ روایت بنایا ہے اور تاریخ سے اس کا رشتہ جوڑ کر تاریخ اور تصوّف دونوں کو ہی صحیح سمت دکھائی ہے۔ اس طرح تصوف کے مطالعہ میں زیادہ حقیقت پسندی اور تاریخی شعور پیدا ہوا ہے تو دوسری طرف تاریخ کو بھی ملفوظات اور کتبِ صوفیا کی صورت میں ایسے نئے مصادر (SOURCES) مل گئے ہیں جنھوں نے تاریخ کا رشتہ عوامی زندگی سے زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ آج اس بات کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ تصوف کی کتابوں میں مورخوں کے لیے مطالعہ کا بہترین مواد موجود ہے اور اس شعور کو بیدار کرنے میں سب سے نمایاں حصہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا رہا ہے۔

ان کے اس عالمانہ لیکچر کے بعد اس موضوع پر کچھ کہنے کی گنجائش کم سے کم میرے لیے تو باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ لیکن میرے عزیز دوست پروفیسر امیر حسن عابدی کے مقالے نے اس طرف متوجہ کیا ہے کہ امیر خسروؒ کی تمام تصانیف کو از سرِ نو فراہم کرنے، ترتیب دینے اور ان کے بہترین ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ اس صدی کے اوائل میں جو کام علی گڑھ میں نواب محمد اسحاق خاں مرحوم کی نگرانی اور بہت سے ممتاز علماء کے تعاون اور نظام حیدر آباد کی سرپرستی میں شروع ہوا تھا وہ یقیناً بہت قابل قدر ہے لیکن ابھی امیر خسروؒ کا بہت سا کلام نظم و نثر غیر مطبوعہ باقی ہے۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں بہت سے نئے قلمی نسخے دریافت ہوگئے ہیں ترکی کے کتب خانہ توپ کاپی سرائے میں حضرت امیر خسروؒ کی متعدد تصانیف کے اچھے قلمی نسخے موجود ہیں جنھیں پروفیسر عابدی خود دیکھ کر آئے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے متعدد مضامین و مقالات لکھے ہیں۔ اور امیر خسروؒ کے نئے غیر مطبوعہ کلام سے ہمیں

روشناس کرایا ہے۔

پروفیسر عابدی دہلی یونیورسٹی میں اپنے طلبا سے ہندوستانی فارسی ادب پر عموماً اور حضرت امیر خسروؒ پر خصوصاً تحقیقی کام بھی کراتے رہے ہیں۔ یونیورسٹی سے باہر بھی بعض اہل علم نے اس طرف توجہ کی ہے لیکن جس نظم و ترتیب اور پلاننگ کے ساتھ اس کام کو ہونا چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ نیشنل امیر خسرو کمیٹی بھی موجود ہے۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی ہے "دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ یونیورسٹیوں میں ایسے اساتذہ ہیں جو اس بڑے منصوبے میں حصہ لے سکتے ہیں ضرورت یہ ہے کہ ایک مرحلہ وار پروگرام بنایا جائے۔ اور اس پر دل جما کر کام کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نیک کام میں حکومت ہند کا بھی مکمل تعاون ضرور حاصل ہو سکے گا۔ ابھی ایک کام تو امیر خسروؒ کی ببلیوگرافی تیار کرنے کا بھی تشنہ رہ گیا ہے۔ اردو میں ایسے CUMULATIVE INDEX کی روایت تو نہیں ہے لیکن تحقیق میں یہ بنیادی کام ہے۔ اور اس طرح کے کچھ کام غالب اور اقبال پر ہوئے بھی ہیں۔ امیر خسروؒ کی بھی ایک مکمل ببلیوگرافی تیار ہونی چاہیے۔ اور یہ کام پروفیسر عابدی کی نگرانی میں دہلی یونیورسٹی میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ حضرت امیر خسروؒ پر اب تک کیا لکھا گیا ہے اور اس کی موضوعاتی تقسیم سے ظاہر ہوگا کہ کون سے پہلو ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ اسی طرح یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہندوستان کی معروف و غیر معروف لائبریریوں اور شخصی ذخیروں میں امیر خسروؒ پر کتنا مواد ملتا ہے۔ ہندوستان سے باہر کے کتب خانوں میں کون کون سے نسخے دستیاب ہیں۔ مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہونا ضروری ہے کہ امیر خسروؒ کی کس تصنیف کے کتنے قلمی نسخے ملتے ہیں اور ان میں کون کون سے زیادہ قدیم ہیں۔ اس بنیادی مواد کے فراہم ہونے سے پہلے کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کوئی مستند کام نہیں ہو سکتا۔

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ایرانی اسکالرز ہندوستان کے فارسی نگاروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن اس پہلو سے بھی ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ہم نے ہندوستان کے کتنے فارسی نگاروں کو سلیقے کے ساتھ متعارف کرنے کی کوشش کی ہے۔ امیر خسروؒ کا کلام وہی نول کشور والا ایران میں چھپا ہے اور اس پر ایک عام سا مقدمہ بھی ہے۔ بیدلؔ پر افغانستان میں کچھ کام ہوا ہے اور اچھا ہوا ہے۔ ایران میں اس پر کوئی کتاب نہیں چھپی فیضی پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ غالب پر نہیں ہے۔ اقبالؔ پر اب چند کتابیں وہاں شائع ہوئی ہیں۔ ہندوستانی فارسی ادب بے مغز اور بے جان شے نہیں ہے اس میں ہمارے لیے کوئی شرمندگی کا سامان بھی نہیں ہے صرف اسے چھان پھٹک کر سلیقے سے پیش کرنے کی ضرورت ہے مجھے امید ہے کہ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی مستقبل میں اپنے کاموں کی توسیع کے وقت ان ضرورتوں کو پیش نظر رکھے گی۔

امیر خسروؒ تیرہویں صدی کے شاعر ہیں۔ مگر ماہ و سال کا یہ زنگار ان کی شخصیت اور شاعری کے زر نگار نقوش کو مدھم نہیں کر سکا ہے۔ وہ اب صرف ایک شاعر ہی نہیں ایک داستان، ایک روایت اور ایک کہاوت بن چکے ہیں ان کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، ہر مذاق کے انسان کو ان کی شخصیت میں اپنے من بھاتے رنگ نظر آجاتے ہیں۔ صدیوں میں ایسی ہمہ جہت شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ ابوریحان محمد بن احمد الخوارزمی البیرونی نہ صرف مشہور مورخ تھا بلکہ اعلیٰ پایہ کا ادیب و شاعر، ریاضی دان، سنسکرت کا عالم اور علم جیوتش کا ماہر تھا۔ اس کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک بار سلطان محمود غزنوی نے ایک چہار دروازہ عمارت تعمیر کروائی۔ اس میں داخل ہو کر البیرونی سے پوچھا: بتاؤ میں کس سمت کے دروازے

سے باہر جاؤں گا؟" البیرونی نے جواب دیا" جہاں پناہ میں اس کا جواب لکھ کر وزیر اعظم کو دے دیتا ہوں۔" چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ محمود کسی سمت کے دروازے سے باہر نہ آیا بلکہ ایک طرف کی دیوار تڑوا کر باہر نکلا۔ البیرونی نے بعینہ یہی اس پرچہ میں لکھ کر وزیر اعظم کو دیا تھا۔ اس پر سلطان محمود غیض وغضب میں آگیا اور حکم دیا کہ البیرونی کو قلعہ کی فصیل سے نیچے پھینک دیا جائے لیکن ایسا کرنے سے پہلے اس نے البیرونی سے دریافت کیا" کیا بتا سکتے ہو کہ اب تمہارا حشر کیا ہوگا؟" اس نے وہی جواب دیا" عالم پناہ! میں اپنے مستقبل کے بارے میں لکھ کر وزیر اعظم کو دیے دیتا ہوں۔" چنانچہ البیرونی کو قلعہ کی فصیل سے پھینکا گیا۔ لیکن محمود نے یہ التزام کر دیا تھا کہ نیچے خادمان ایک بڑا قالین لیے کھڑے رہیں تاکہ البیرونی اس پر گرے۔ چنانچہ یہی ہوا اور یہی البیرونی نے اس پرچہ میں لکھا تھا جو وزیر اعظم کو دیا تھا کہ بادشاہ مجھ کو قلعہ کی فصیل سے پھنکوانے کا حکم دے گا لیکن میں زندہ سلامت بچ جاؤں گا۔[۱]

پندرہویں صدی عیسوی میں یوروپ میں ایک ایسی ہی شخصیت LEONARDO DA VINCI کی تھی، جو نہ صرف اپنے دور کا عظیم مصور تھا بلکہ اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین مصوروں میں ہوتا ہے۔ اس کی مشہور عالم تصویر MONALISA کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ میاں خود بھی یہ تصویر بناتے تو شاید وہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ جو اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ LEONARDO DA VINCI نہ صرف مصور تھا بلکہ ایک زبردست سائنس داں بھی تھا۔ حال ہی میں اس کی چند SKETCH BOOKS اسپین میں ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے HELICOPTER کا ڈیزائن اس وقت پیش کیا تھا۔

ہمارے دور میں ایسی ہی MANY-SPLENDOURED PERSONALITY تھی BERTRAND RUSSELL کی، جو نہ صرف فلسفی تھا بلکہ ریاضی داں تھا، ماہر سیاسیات ومعاشیات تھا اور باکمال ادیب بھی تھا اس پر طرہ یہ کہ حسن نسوانی تھا بجلی اس کی فطرت کے لیے

امیر خسروؒ بھی ایک ایسی ہی ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ شاعر تھے۔ نثر نگار تھے موسیقار تھے مورخ تھے۔ امیر تھے۔ فقیر تھے، صوفی تھے، نہ صرف اہلِ قلم تھے بلکہ اہلِ سیف بھی تھے

افسوس کہ ہمارا دور SPECIALISATION کا دور ہے، اور اب تو یہ عالم ہے کہ ایک ڈاکٹر دائیں گردہ کا ماہر ہے تو دوسرا بائیں گردہ کا ماہر ہے۔ یہ دور MINIATURIZATION کا ہے، MICROSHIPS کا ہے، COMPUTORS کا ہے۔ گویا یہ دور بونوں کا ہے۔ دیو زادوں کا نہیں۔

میں علامہ اقبال کے الفاظ میں حضرت امیر خسروؒ کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں ؎

خسروِ شیریں زباں، رنگیں بیاں | نغمہ ہایش از ضمیر کن فکاں
(خسرو شیریں زبان اور رنگین بیان تھے۔ ان کے نغمے ضمیر تخلیق سے پھوٹتے تھے، گویا الہامی تھے)

فطرتش روشن مثال ماہتاب | گشت از بہر سفارت انتخاب
(ان کی فطرت چاند کی طرح روشن تھی اور درجہ مصاحبت کے لیے موزوں تھی)

چنگ را پیش قلندر چوں نواخت | از نوائے شیشۂ جانش گداخت
(قلندر یعنی حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں ساز بجاتے تھے تو اس کی تانوں سے ان کی روح گداختہ ہو جاتی تھی)

شوکتے کو پختہ چوں کہسار بود | قیمتِ یک نغمۂ گفتار بود
(وہ شان وشوکت جو پہاڑ کی طرف اٹل تھی، ان کے ایک نغمہ اور نظم کا مول تھی)

[۱] ماخذ: پروفیسر براؤن (E. G. BROWN) کی تصنیف HISTORY OF PERSIAN LITERATURE

امیر خسروؒ ہر صنفِ سخن میں کمال رکھتے تھے۔ بادشاہوں اور امیروں کی تعریف میں قصیدے بھی لکھتے تھے اور صلے میں ہزاروں روپے اور اشرفیاں اور خلعتیں بھی پاتے تھے۔ مگر دربار سے باہر آکر وہ روپیہ مساکین اور ضرورت مندوں میں بے دریغ تقسیم بھی کر دیتے تھے۔ انھوں نے خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی گزاری، مگر نہ اپنے لیے عالی شان محل کھڑے کیے نہ خزانہ جمع کیا، نہ فضول قسم کے رئیسانہ ٹھاٹ اور چونچلے اختیار کیے، ایک متوازن زندگی سلامت روی کے ساتھ گزاری۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں جب سلطنت حاصل کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں اور سازشیں ہوتی رہتی تھیں اور ایک بادشاہ کو قتل کرکے دوسرا تخت نشین ہوتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ مقتول بادشاہ کا کوئی نام لیوا یا ہمدرد بھی زندہ نہ رہنے پائے تاکہ وہ انتقام لینے کی سازش نہ کرسکے، امیر خسروؒ نے ہر بادشاہ کے دربار سے اپنی وابستگی کو باقی رکھا اور کسی نے ان پر سازش، کینہ دوزی، یا ریشہ دوانی کا شبہ نہیں کیا، یہ وہ کیفیت تھی جسے صوفیا کی اصطلاح میں "با ہمہ اور بے ہمہ" کہتے ہیں۔

وہ خانقاہی آدمی بھی تھے اور خانقاہ بھی کیسی جس کے سربراہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ جیسے عظیم المرتبت جلیل القدر صوفی تھے۔ خانقاہ سے وابستہ ہونے والوں کو سرکاری ملازمت قبول کرنے یا کوئی مستقل ذریعہ معاش پیدا کرنے کی اجازت نہیں تھی، مگر حضرت امیر خسروؒ اس شرط سے بھی مستثنیٰ تھے انھوں نے شاہانِ وقت کی مدح سرائی ضرور کی ہے، مگر اپنے پیر و مرشد کی منقبت بادشاہ کی تعریف سے پہلے ہی لکھی ہے اور دونوں میں آورد اور آمد کا فرق صاف نظر آتا ہے۔

وہ واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے کہ بادشاہ جلال الدین خلجی نے بھیس بدل کر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ میں حاضری دینے کا ارادہ کیا۔ حضرتؒ کا قاعدہ تھا کہ نہ خود دربار میں تشریف لے جاتے تھے نہ بادشاہوں کو اپنی خانقاہ میں آنے کی اجازت دیتے تھے۔ امیر خسروؒ نے بادشاہ کے اس ارادے سے اپنے پیر و مرشد کو آگاہ کردیا تو آپ دلی چھوڑ کر اجودھن روانہ ہوگئے، بادشاہ نے امیر خسروؒ پر عتاب کیا کہ تم نے ہمارے ارادے کی انھیں اطلاع کیوں دی، تو خسروؒ نے کہا کہ جہاں پناہ کی نافرمانی سے مجھے زیادہ سے زیادہ جان کا خطرہ تھا مگر اپنے مرشد کی نافرمانی میں زوالِ ایمان کا خطرہ تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہ ہمہ فنی شاعر تھے، قصیدہ، غزل، مثنوی، ترانہ، رباعی سب کچھ انھوں نے یکساں قدرت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ بقول ضیاء الدین برنی، ان کا کلام پورے کتب خانہ کے برابر ہے، دولت شاہ سمرقندی نے لکھا ہے کہ پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زائد ابیات لکھیں۔ صرف نظم ہی نہیں انھوں نے نثر میں بھی اپنے علمی کمالات کا بھرپور اظہار کیا ہے، اس زمانے میں فارسی انشاء پردازی کا جو مقبول اسلوب تھا اس کے علاوہ ہر طرح کی لفظی و معنوی صنعتوں کے ساتھ فارسی نثر کے اسالیب کو برتا ہے۔ آج ہمیں "دلائل الاعجاز" کی نثر متاثر نہ کرے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ نثر ہی ناقص ہے بلکہ اب مذاق بدل گئے ہیں اور جو باتیں اس زمانے میں دلیلِ کمال سمجھی جاتی تھیں اب انھیں اسلوب کے معائب میں شمار کیا جاتا ہے۔

غزل میں انھوں نے سادگی اور صفائی کے ساتھ سوز و گداز اور شیریں کلامی کا ایسا حسین مرکب تیار کیا کہ آج تک قوالی کی محفلوں میں ان کے اشعار پر وجد و کیف ہوتا ہے، ایک زندہ آواز ہے جو صدیوں سے گونج رہی ہے، وہ فارسی ہی میں بند نہیں تھے۔ ہندی ان کی مادری زبان تھی، قبائلی زبان ترکی اور اس عہد کی مذہبی زبان عربی تھی۔ تصنیف و تالیف کے لیے فارسی کا رواج تھا کہ وہ علمی زبان سمجھی جاتی تھی۔ بعض حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت سے بھی واقف تھے ہندوستان کی مختلف بولیوں کا تذکرہ ہمیں سب سے پہلے

ان کی تصانیف میں ملتا ہے۔ ہندی میں ان کا کلام ضرور تھا اور ایک دیوان کے برابر تھا مگر وہ انھوں نے کبھی سنجیدگی سے جمع نہیں کیا۔ لکھ کر دوستوں کو دے دیتے تھے۔ آج سینکڑوں کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دوہے، دو سخنے، گیت اور ملہار حضرت امیر خسروؒ سے منسوب ہیں اور عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخی سند کا ملنا تو مشکل ہے۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ صدیوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے آئے ہیں۔ ان میں لفظی ردّ و بدل بھی ضرور ہوا ہوگا۔ مگر ان کی اصلی صورت حضرت امیر خسروؒ کی تخلیق رہی ہوگی۔ اس میں الحاقی کلام کو چھوڑ کر باقی کلام کا دوسرا دعویدار بھی نہیں ہے۔ اس لیے جس کے نام سے مشہور ہو گیا سند نہ ہونے پر بھی اسی کا مانا جائے گا۔ البتہ ایسے کلام سے ادبی اور لسانی ارتقاء وغیرہ کے نتائج برآمد کرنا اصول تحقیق کے خلاف سمجھا جائے گا۔

آج ساری دنیا میں FOLK LITERATURE ادب العوام کی سماجی اور تہذیبی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ کسی قوم کے مزاج کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں حضرت امیر خسروؒ کو اس ادب العوام کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جانا چاہیے ہوگا۔

ایک اور پہلو حضرت امیر خسروؒ کی موسیقی دانی کا ہے انھوں نے اس فن میں بھی وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک اس فن کے ماہرین ان کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے بعض نئے ساز ایجاد کیے اور روایتی سازوں میں ترمیم کر کے انھیں نئی شکل عطا کی۔ ہندوستانی اور ولایتی راگوں کو ملا کر نئے راگ راگنیاں تیار کیں۔ وہ باقاعدہ موسیقار نہیں تھے، مگر فرصت یا انبساط کے لمحوں میں اپنے پیر و مرشد کا دل بہلانے کے لیے کچھ سنایا کرتے تھے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو پوربی راگ بہت پسند تھا۔ اور فرماتے تھے، "ہم بوڑھے ہو گئے مگر یہ راگ سدا جوان ہے"۔ امیر خسروؒ اس میں نئے نئے سُر اور پتیاں لگاتے تھے۔

جو لوگ بادشاہوں اور امیروں کی صحبت میں رہتے تھے ان کا مجلسی علم بھی خوب ہوتا تھا۔ وہ بات کہنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ بہت معمولی سی بات کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا یا کسی غیر مانوس بات کو مانوس انداز میں کہنا ان کا خاص سلیقہ ہوتا تھا۔ امیر خسروؒ نے رنگا رنگ بزم آرائیاں کی تھیں اور سو بادشاہوں کا دربار تو "شاہنشہِ بے سریر و بے تاج" حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ تھی۔ جہاں سلیقہ غلام اور تہذیب باندی بن کر رہتے تھے۔ امیر خسروؒ کی شیرینی کلام کا یہ عالم تھا کہ حضرت محبوب الہیؒ نے فرمایا: "کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ میں ہر شخص سے اکتا جاتا ہوں۔ مگر اس ترک (یعنی امیر خسروؒ) سے کبھی نہیں اکتاتا۔" حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ "اگر قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لے کر آیا؟ تو میں کہوں گا کہ "سوزِ سینۂ خسروؒ" لایا ہوں"۔ یہ کوئی معمولی ریمارک نہیں ہے۔ ان چار لفظوں میں امیر خسروؒ کی پوری شخصیت سمٹ کر آ گئی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی تعریف ہو سکتی ہے نہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے زیادہ کوئی اس "سوزِ سینہ" کا قدردان ہو سکتا ہے۔ یہ سوز ہی کفر و دین کا ماحصل ہے۔ یہی سب کچھ بلکہ سب کچھ کا حاصل ہے۔ اسی لیے عطارؒ[1] نے دعا مانگی تھی ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرّۂ دردے دلِ عطار را

(کافر کو کفر اور دین دار کو دین عطا ہو اور ذرا سا درد عطار کے دل کو عطا کر)

یہ نعمتِ درد امیر خسروؒ کو اپنے پیر و مرشد کی خانقاہ سے ملی تھی۔ انھوں نے اسے اپنے کلام کے وسیلے عام کر دیا۔ یہ اسی کا ہلکا سا کیف ہے جو ہمارے آپ کے دل میں آج بھی کسک بن کر جاگ اٹھتا ہے۔

---

[1] فارسی کا مشہور صوفی شاعر۔

اس عہد میں خواص کا تعلق درباروں سے اور عوام کا ربط صوفیا کی خانقاہوں سے تھا۔ دونوں دنیائیں الگ الگ بس رہی تھیں اور ان میں کوئی تال میل نہیں تھا مگر امیر خسروؒ کے کلام میں یہ دونوں افق مل گئے ہیں اور پورا ماحول ایک وحدت کی شکل میں سامنے آتا ہے

حضرات! یہ معروضات کچھ طویل ضرور ہو گئے مگر ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

(کہانی دلچسپ تھی اس لیے ذرا زیادہ لمبی ہو گئی)

امیر خسروؒ کی شخصیت کے کس پہلو پر گفتگو ہو اور کسے چھوڑا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے آخر میں ان کی صرف دو خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا۔

عہد سلطنت میں تاریخ نویسی کا آغاز ہو چکا تھا مگر اس زمانے کی بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ تاہم اس عہد کے بعض شاعروں کا کلام آج کے مؤرخوں کا مستند ماخذ ہے۔ امیر خسروؒ اس اعتبار سے بھی منفرد ہیں کہ انھوں نے تاریخی مثنویاں لکھی ہیں۔ جیسے قران السعدین، دول رانی خضر خاں، تغلق نامہ اور خزائن الفتوح، ان میں سے بعض تو اپنے دور کا واحد ماخذ ہیں۔ تاریخ ہند کے مولف ایلیٹ نے جا بجا ان کے بیانات کے حوالے دیے ہیں۔

دوسری خصوصیت ان کی وطن دوستی اور قوم پرستی ہے، جسے آج ہم "قومی یکجہتی" کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ اور جس کا حال یہ ہو گیا ہے کہ بقول سوداؔ

؎ جس سے پوچھا میں، دل خوش ہے کہیں دنیا میں؟
رو دیا اُن نے، اور اتنا ہی کہا "کہتے ہیں"

اس زمانے میں مغرب کا دیا ہوا تحفہ "نظریہ قومیت" نہیں تھا مگر قومی یکجہتی ضرور موجود تھی۔ امیرؒ کے زمانے میں بھی متعدد شاعر تھے، ان سے پہلے بھی ہوئے، بعد کی نسلوں میں بھی شاعروں کی کمی نہ ہوئی، مگر کسی کے کلام میں ہندوستان اور ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی ایسی دلکش اور رنگارنگ جھلکیاں نہیں ملتیں جتنی ہمیں امیرؒ کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ وہ ہندوستان کے سچے پرستار ہیں۔ یہاں کے موسموں کو سراہتے ہیں پھلوں اور پھولوں کا محبت سے ذکر کرتے ہیں، بولی ٹھٹولی، رسم و رواج، میلے ٹھیلے، لباس، غذائیں، بود و باش، رہن سہن سب سے اپنی گہری دلچسپی اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ مثنوی "نہ سپہر" میں پورا ایک باب ہندوستان کی تعریف کے لیے وقف کر دیا ہے۔ جس میں ۴۵۰۹ (چار ہزار پانچ سو نو) اشعار ہندوستان کی مدح میں ہیں۔ وہ ہندوستان کو ساری دنیا سے افضل بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا سوتا یہیں سے پھوٹتا ہے۔

امیر خسروؒ قومی یکجہتی کے سب سے اول علمبردار تھے اور آج ضرورت ہے کہ ان کے کلام اور پیغام کو عام کیا جائے۔

(خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی دلی نے حضرت امیر خسروؒ پر ایک سیمینار ۷ر جولائی ۱۹۸۴ء کو خواجہ ہال میں منعقد کیا تھا۔ اس میں یہ خطبہ صدارت پڑھا گیا)